''تلامذۂ غالب'' از مالک رام کا تنقیدی جائزہ

A Critical review of "Talamzae Ghalib" by Malik Ram

زیب النساء
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر ظفر حسین ہرل
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Zaib-un-Nisa
Ph. D Scholar, Dept. of Urdu, Govt. College University, Faisalabad.
Dr. Zafar Hussain Harral
Assistant Professor, Dept. of Urdu, Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

Mirza Asadullah Khan Ghalib is not unknown in the history of Urdu literature. He is the Poet. The teacher of poets and father of Urdu poetry. Malik Ram is a researcher, critic, essay writer and sketch writer. His compilation of the book"Talmzae Ghalib" contain thelist & short biography of Ghalib's pupils. It was the time when Mughal Empire was falling and British took over the charge of government by hook or crook. The literature especially the poetry portrays that time in symbolic way. Malik Ram tried his best to collect the correct data.

Key Words: Ghalib, Urdu, Literature, Poetry, Pupils, Malik Ram

کلیدی الفاظ: غالب، اردو، ادب، شاعری، تلامذہ، مالک رام

''تلامذۂ غالب'' کے مؤلف و مصنف معروف محقق،ناقد،خاکہ نگار، انشا پرداز، تبصرہ نگار مالک رام ہیں۔ مالک رام بلاشبہ اردو کے بہت بڑے محقق ، غالب شناس ،عربی،فارسی اور اسلام سے گہری دل چسپی رکھنے والے کامیاب مترجم نے تحقیق کے میدان میں نیا اسکول قائم کر کے متنوع موضوعات پر گراں قدر تصانیف کا دائرہ وسیع کیاجو کسی تعارف کا محتاج نہیں اور خراجِ تحسین کا مرتبہ رکھتا ہے اور اس کی بدولت ہی ان کی شہرت مختلف اور متنوع حیثیتوں کی بناپر ہے۔ تذکروں کی بابت ناقدوں اور تحقیق کاروں کے تحفظات

میں تصنیف راقم الحروف ''تلامذۂ غالب'' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ان کے حالات زندگی کے سلسلے میں ''انسائیکلوپیڈیا ادبیاتِ عالم (دنیا اور پاکستان)'' میں کچھ اس طرح ذکر ہے:

> ''مالک رام (۱۹۰۶ء۔۱۹۹۳ء) پورا نام مالک رام اردو، انگلش کا سوانح نگار، مؤلف اور محقق۔ اس کا باپ لالہ نہال چند انگریزی حکومت میں محکمہ کمسٹریٹ میں ملازم تھا۔ ملازمت کے دوران تقریباً سات سال چین میں مقیم رہا۔ مالک رام نے ابتدائی تعلیم ایک مقامی گوردوارے میں حاصل کی۔ اپریل ۱۹۱۲ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے مڈل پاس کیا۔ ۱۹۲۴ء میں دسویں کا امتحان، ۱۹۲۸ء میں ڈی۔اے۔وی کالج (لاہور) سے بی۔اے پاس کیا وہیں سے ۱۹۳۲ء میں ایل ۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کی ملازمت کا آغاز ''ریہ گزٹ'' میں نامہ نگار کے طور پر ہوا۔ ۳۶۔۱۹۳۱ء میں وہ ماہنامہ ''نیرنگِ خیال'' لاہور کا ایڈیٹر رہا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں ''بھارت ماتا'' لاہور سے منسلک ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء میں اسے سرکاری ملازمت مل گئی۔ ۱۹۳۹ء میں مالک رام سکندریہ (مصر) میں ہندوستان کے ٹریڈ کمشنر کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر بھیجا گیا۔ مصر میں ملازمت کے دوران اسے ترکی، شام، لبنان، عراق، خلیج فارس کی ریاستوں اردن، فلسطین اور سوڈان وغیرہ کے دوروں کا موقع ملا۔ ۱۹۴۷ء میں مالک رام انڈین فارن سروس میں لے لیا گیا۔ تقرر قاہرہ میں ہوا۔ ہندوستان واپس آنے پر ساہتیہ اکادمی میں اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔۵۷۔۱۹۵۶ء میں اس نے ابوالکلام آزاد کی ''ترجمان القرآن'' (چار جلدیں)، ''غبارِ خاطر'' اور ''خطباتِ آزاد'' مرتب کیں۔''(۱)

تذکرہ نگاری کی روایت میں معروف محقق اور ماہرِ غالبیات مالک رام صاحب نے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کی چار جلدوں پر مشتمل کتاب ''تذکرہ معاصرین'' اہم نوعیت کی ایک کڑی ہے اس کی پہلی جلد ۱۹۷۲ء میں، دوسری ۱۹۷۶ء میں، تیسری ۱۹۷۸ء میں اور چوتھی ۱۹۸۲ء میں اشاعت پذیر ہوئی تھی اور اس تذکرے میں وفات پانے والے لگ بھگ تمام معروف ادبا و شعرا کے حالات و کوائف قلم بند کیے گئے ہیں۔ مرحوم کا تذکرہ ''ماہ و سال'' بھی اس سلسلے میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے علاوہ مالک رام کی تصانیف میں ''ذکرِ غالب'' ۱۹۳۸ء، ''تلامذۂ غالب'' (پہلا ایڈیشن) ۱۹۵۷ء، ''فسانۂ غالب'' ۱۹۷۷ء، ''گفتارِ غالب'' ۱۹۸۵ء، انگریزی میں ''مرزا غالب'' ۱۹۶۸ء، ''قدیم دہلی کالج'' ۱۹۷۵ء، ''وہ صورتیں الٰہی'' ۱۹۷۴ء، انگریزی میں ''حالی'' ۱۹۸۲ء، ''عورت اور اسلامی تعلیم'' ۱۹۵۱ء، مالک رام نے

غالب کی جو تصانیف مرتب کی تھیں وہ ''سبد چین''فارسی۱۹۳۸ء، ''دیوان اور غالب'' ۱۹۵۷ء، ''گلِ رعنا'' ۱۹۷۰ءاس کے علاوہ اپنے پانچ معاصرین پر انگریزی اور اردو میں کتابیں مرتب کیں۔ مولانا امتیاز علی خان عرشی پر ''نذر عرشی''(بااشتراک پروفیسر مختارالدین احمد)، ڈاکٹر حسین ذاکر پر ''نذرِ ذاکر'' ۱۹۶۷ء، ڈاکٹر عابد حسین پر ''نذرِ عابد'' ۱۹۷۴ء، کرنل بشیر حسین زیدی پر ''نذرِ زیدی'' اور خلیفہ عبدالحکیم پر ''نذرِ حمید'' ان کے علاوہ مالک رام نے مختلف موضوعات پر دو سو کے قریب مضامین بھی لکھے جو رسالوں میں شائع ہوئے۔ ''تحریر'' کے نام سے مالک رام نے ایک علمی رسالے کی ادارت بھی کی۔ غالبیات ان کے اختصاص کا میدان رہا ہے۔ بقول پروفیسر نذیر احمد:

> ''مالک رام صاحب کا نام مالک رام بویجہ ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اداراتی زندگی میں ایم۔ آر بویجہ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ مالک رام نام سے نہیں ایک بار ان کے افسرِ اعلیٰ نے ان کو ایم۔ آر بویجہ کے نام سے یاد کیا لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ وہی مالک رام ہیں جن کی تحریروں کو وہ پڑھ چکے ہیں تو وہ خود ان سے ملنے آئے، علمی قدر دانی کی، ایسی مثالیں کہاں ملتی ہیں۔''(۲)

پروفیسر مسعود حسین، مالک رام صاحب کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

> ''تحقیق کے میدان میں ان کا عام انداز حزم و احتیاط کا ہے۔ وہ اس میں ہر طرح کی جانبداری سے پرہیز کرتے ہیں۔ خطری ہوتے ہوئے بھی جب وہ تحقیق کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو اس نسلی امتیاز کو (جو کبھی کبھی اُن کی ہر گفتگو میں ابھر آتا ہے) پسِ پشت ڈال کر اپنے نتائج کے استنباط میں معروضیت سے کام لیتے ہیں۔''(۳)

تلامذۂ غالب کا زیرِ نظر ایڈیشن ادارہ یادگار غالب کراچی سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ مذکور تذکرہ اشاعت کے سلسلے میں ضمیمے نمبر ۲ میں بہ عنوان ''تلامذۂ غالب طبع ثانی پر ایک نظر'' میں خود مالک رام یوں بیان کرتے ہیں:

> ''تلامذۂ غالب'' کا تازہ ایڈیشن مئی ۱۹۸۴ء میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن فروری ۱۹۵۷ء میں مرکز تصنیف و تالیف نکودر (پنجاب) سے شائع ہوا تھا۔ ۲۶ برس کے اس درمیانی عرصے میں کئی اہم مضامین بھی شائع ہوئے جن کی وساطت سے اس سے متعلق نیا مواد بھی سامنے آیا اور سابقہ معلومات کی بہت سی خامیاں بھی دور ہوئیں۔''(۴)

مذکورہ تذکرہ کی وساطت سے سرزمین دہلی مردم خیز خطہ ہے جس میں بے شمار علما، صوفیا اور ماہرینِ لسانیات نے جنم لیا ہے۔ زبان کی ترقی اور رفتارِ ادب کو پروان چڑھانے میں

یہاں کے اہلِ قلم نے بھرپور انداز میں حصہ لیا اور تاریخ ساز خدمات انجام دیں۔ اس لحاظ سے سرزمین دہلی کو علم و ادب کا گہوارہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اردو زبان کی تاریخ میں شاہ جہاں کا عہد بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اب مغلوں اور ایرانیوں کو اس ملک میں رہتے ایک صدی سے زیادہ مدت گزر چکی تھی چنانچہ وہ بھی فارسی امیز اردو بولنے لگے تھے۔ اگرچہ اس زبان میں شعر و شاعری کرنا یا کچھ لکھنا وہ ہنوز اپنے لیے عار سمجھتے تھے۔ دوئ مش شاہ جہان نے دہلی کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں اس شہر کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی تھی کیونکہ اکبر نے اپنا دارالسلطنت آگرہ (فتح پور۔۔) میں منتقل کر لیا تھا اور جہانگیر کا زیادہ وقت آگرہ اور لاہور میں گزرتا تھا۔ البتہ شاہ جہان جب دہلی میں لال قلعہ تعمیر کیا اور ۱۶۳۸ء میں خود بھی وہاں منتقل ہو گیا تو دہلی کی قسمت دفعتاً جاگ اُٹھی۔ عمائدین سلطنت، اُمرا، اہلِ علم و فضل، سرکاری ملازمین، اہلِ حرفہ اور لشکری سبھی دہلی میں آکر آباد ہونے لگے۔ شاہی دربار سے وابستہ ہونے کے باعث ان لوگوں کو بہت شائستہ اور مہذب خیال کیا جاتا تھا۔ ان کی زبان زیادہ معتبر اور مستند سمجھی جاتی تھی اور پڑھے لکھے لوگ ان کی بول چال کو معیار مان کر ان کی تقلید کرتے تھے۔ یہ لوگ قلعے کے گرد و نواح میں بستے تھے چنانچہ ان کی بستی کو جس میں قلعہ بھی شامل تھا، شاہ جہان آباد کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے تذکرہ نویسوں نے یہاں کی زبان کو اردو معلیٰ شاہ جہان آباد دہلی کا لقب دیا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے "مقدمۂ گل عجائب" میں اورنگ آباد اردو زبان کی اثر پذیری کے تاریخی تناظر میں لکھا ہے:

> "اورنگ زیب عالم گیر کی ایک عمر دکن میں بسر ہوئی۔ عالمِ شہزادگی میں بھی شہنشاہ ہونے کے بعد بھی اس کا مستقر اورنگ آباد خجستہ بنیاد تھا اور کئی لاکھ فوج اس کے ساتھ تھی، وہیں مقیم تھی اور سارا ڈھنگ دلی کا سا نظر آتا تھا، چنانچہ اس زمانے کی زبان صاف شہادت دے رہی ہے۔ سراج کے کلام کا مقابلہ آبرو، حاتم، ناجی وغیرہ سے کیجیے، معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی مقام کے شاعر ہیں۔ یہ سلسلہ آصف جاہ اول تک برابر جاری رہا۔ جب وہ دلی سے اورنگ آباد آئے تو دلی کی آبادی کا منتخب حصہ راجا کے ساتھ یہیں آکر متوطن ہو گیا۔ اس زمانے تک شمالی ہند کی زبان کا اثر اورنگ آباد میں پوری طرح باقی رہا۔"(۵)

اس لحاظ سے سرزمینِ رام پور ادبی دنیا میں ان گنت پہلوؤں کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ جب بھی رام پور کا نام لیا جاتا ہے ذہن کے دریچوں میں اردو ادب کے ان مشاہیر کا

خیال ابھرتا ہے جو نواب کلب خان کی علم پروری کی وجہ سے دائرہ ادب میں جمع ہو گئے تھے۔ جلال لکھنوی امیر اللہ تسلیم، امیر مینائی، رام پور کی رضا لائبریری کی تو بات ہی الگ ہے، مولانا عرشی اور غالب اور ان کی تحقیقات خاصے کی چیز ہیں۔

اردو تذکرہ نگاری ہماری معلومات میں بیش بہا اضافے کا باعث ہے جس طرح انیسویں صدی کے تذکروں میں شعرا کے حالاتِ زندگی، ان کی تصاویر، ان کی قلمی تحریریں اور کہیں کہیں ان کے شاعرانہ اسلوب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے ساتھ تنقید کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں اسی طرح بیسویں صدی کے تذکروں میں تہذیب و تمدن، شعرا کے خاندانی و سماجی پس منظر، شعرا کے آپس کے تعلقات، سیاسی اور ملکی حالات تذکروں کی صورت قلم بند کیے گئے ہیں اور کتابی صورت میں منصۂ شہود پر آتے رہے ہیں اسی روایت کے پیشِ نظر شعرا کے تلامذہ کے تذکرے بھی لکھے جانے لگے۔ اسی ضمن میں مذکور تذکرہ میں معین الدین عقیل یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ہماری تذکرہ نویسی نے متوازی طور پر ایک روایت کو جنم دیا ہے جو تلامذہ کے تذکروں کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اس روایت کے تحت کسی ایک شاعر کے تلامذہ کا تذکرہ بھی لکھا جانے لگا اور یوں میر، آتش، مکین، مصحفی، داغ، صفی اورنگ آبادی، انیس وغیرہ کے شاگردوں کے تذکرے لکھے گئے لیکن اس روایت کے ضمن میں جو اہتمام غالب کے شاگردوں کا تذکرہ لکھنے میں روا رکھا گیا اور جو تلاش تحقیق غالب کے تلامذہ کے تعلق سے کی گئی وہ ایک مثال ہے اور اس میں بھی مالک رام نے تلامذہ غالب کے حوالے سے جو دادِ تحقیق دی ہے وہ بھی ایک مثال ہے۔''(۶)

اسی سلسلے میں ''تلامذۂ غالب'' کی تمہیدی داستان کے سفر کے حوالے سے ''دیباچہ طبع دوم'' میں خود مالک رام بیان کرتے ہیں:

> ''لیکن اب مجھے ایک اور خیال آیا کہ کیوں نہ غالب کے شاگردوں کے حالات جمع کیے جائیں چند ایک کے سوا دوسروں کے نام تک معلوم نہیں تھے، اور جن کے معلوم تھے، ان کے بھی حالات پردۂ خفا میں تھے۔ میں نے تذکرے جمع کرنا شروع کیے اور کوئی سال بھر میں ان کا اچھا خاصا ذخیرہ یک جا کر لیا، کچھ اور متعلقہ کتابیں بھی دستیاب ہو گئیں۔''(۷)

''تلامذۂ غالب'' کی تصنیف و تالیف کے ضمن میں مصنف تذکرہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ترتیب و تدوین تو کیا سچ یہ ہے کہ یہ بھی

جنوں کا ایک انداز تھا۔ نہ تمام ضروری
کتابیں مہیا تھیں، نہ کوئی ایسا شخص قریب،
جس سے مشورہ یا تبادلۂ خیالات کیا جا سکتا۔
بہر حال میں ہمت نہیں ہارا، جب کبھی
فرائض منصبی سے کچھ فرصت ملتی میں
موضوع کے لیے مواد جمع کرتا رہا۔
۱۹۵۴ء میں جب دلی پہنچا تو مکان تلاش
کرنے اور سامان کھولنے میں کچھ وقت لگا،
۱۹۵۵ء کے وسط میں ان منتشر یادداشتوں کو
جمع کیا اور اب کتاب کا ڈول ڈالا۔"(۸)

شاعری میں استادی و شاگردی کا سلسلہ بھی تذکروں کی طرح فارسی زبان سے مستعار لیا گیا اور غالب نے اپنے شاگردوں کے کلام پر جن فنی پہلوؤں سے اصلاح دی اور عروض کے نکات بتاتے ہوئے ان کی ذاتی صلاحیتوں کی تربیت کی اور ان کی مخفی شاعرانہ قوتوں کو اس ڈھنگ سے ابھارا کہ ان کے شاعرانہ ذوق سے ان کے خیالات و رجحانات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے تو غالب کے اس غیر معمولی سلسلے کو مالک رام "دیباچۂ طبع اول" میں یوں بیان کرتے ہیں:

"غالب کے شاگردوں میں بہت کم اپنے استاد کے رنگ میں کہنے والے ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ غالب اس نکتے کو خوب سمجھتے تھے کہ چہرے مہرے کی طرح ہر شخص اپنا مزاج اور مذاق بھی قدرت کی طرف سے لے کر آتا ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی بدلنے کی کوشش کرنا، اُسے مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ شاگرد کے کلام کے ظاہری دروبست اور فنی و لغوی اسقام کی اصلاح کی جائے، لیکن اس کے طرزِ سخن کو جوں کا توں قائم رہنے دیا جائے، تاکہ اس کی انفرادیت پختہ ہو جائے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمیں غالب کے شاگردوں میں اتنے زیادہ صاحبِ طرز شاعر ملتے ہیں۔ انور ،تفتہ، ثاقب، حالی، رشکی، سالک، سخن، شاداں، شیفتہ، عارف، عرشی، مجروح، ناظم، ان میں سے ہر ایک کا رنگ الگ ہے۔ اپنی اپنی جگہ ہر ایک پختہ کار اور صاحبِ فن استاد ہے۔"(۹)

مصنف تذکرہ نے پہلے سے مذکور تذکروں میں بعض حضرات کی شاگردی اور تلمذ پر شبہے کا اظہار کرتے ہوئے انھیں تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے غالب کے شاگردوں میں کچھ ایسے اصحاب کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً نساخ نے مرزا باقر علی خان کامل کو غالب کا شاگرد لکھا ہے، حال آنکہ وہ قربان علی خان سالک کے شاگرد تھے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت نے نظام رام پوری کو غالب کا شاگرد بیان کیا ہے، وہ شیخ علی بخش بیمار کے تلامذہ میں سے تھے۔ ضیغم حیدرآبادی اور حسرت موہانی نے منشی بنواری لال شعلہ کو تلامذہ غالب میں شامل کر لیا ہے، وہ تفتہ اور بے صبر کے شاگرد تھے۔ ایک جدید تذکرہ (مشرقی بنگال میں اردو) کے مصنف نے سید محمود ایاز (سید محمد آزاد ''نوابی دربار'' والے کے بڑے بھائی) کو غالب کا شاگرد لکھا ہے ۔ یہ بھی ٹھیک نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ کسی تذکرہ نویس نے آج تک اس کا ذکر نہیں کیا، من جملہ اور باتوں کے صرف ایک ہی بات اس کی تغلیط کے لیے کافی ہے، قاطع برہان کے معرکے میں آغا احمد علی احمد نے جو کتاب ''مؤید برہان'' کے نام سے لکھی تھی، اس کے آخر میں ''برادرِ عزیزم سید محمود المتخلص بہ شیدا سلمہ اللہ تعالیٰ'' کی منظوم تقریظ اور تاریخ موجود ہے (اُن دنوں وہ شیدا تخلص کرتے تھے)۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ آزاد اپنے استاد کے خلاف ایک کتاب اور اس کے مصنف کے ساتھ اس طرح اعلانیہ اپنی عقیدت اور دوستی کا اظہار کرتے! پھر مزید ستم یہ کیا ہے کہ غالب کے سفر کلکتہ کے دوران میں سید محمود کی ان سے ملاقات بیان کی ہے۔ سید محمود ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے اور غالب ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے واپس بھی آ چکے تھے۔

> ''دیباچہ طبع اول'' میں نواب کلب علی خان اور میر منشی سہیل چند کے تلمذ غالب کے بارے میں لکھتے ہیں:
>
> ''نواب کلب علی خان خلد آشیان نے ابتدا میں ایک فارسی نثر غالب کی خدمت میں اصلاح کے لیے بھیجی تھی۔ بدقسمتی سے اس پہلی اصلاح پر ہی ایک ناخوشگوار بحث چھڑ گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد انھوں نے کوئی اور چیز میرزا کے پاس نہیں بھیجی۔ اسی طرح دربار رام پور کے میر منشی سہیل چند نے بھی ایک خاص موقع پر چند شعر کہے اور غالباً ان پر اصلاح بھی لی؟ لیکن نہ وہ شاعر تھے، نہ یہ اصلاح کا تعلق ہی کوئی چیز تھی۔ انھوں نے تفنن طبع سے چند شعر کہے اور غالب نے بھی اُسی طرح اصلاح دے دی۔ اس لیے میں نے یہ دونوں نام بھی تذکرے میں شامل نہیں کیے۔''(۱۰)

الگزنڈر ہیدرلی آزاد (عرف الک صاحب) کے تلامذ غالب کے سلسلے میں مالک رام کا دیباچہ طبع دوم میں یوں بیان ہے:

''بعض اصحاب کا اس پر اصرار ہے کہ الگزنڈر ہیدرلی آزاد (عرف الک صاحب) کو تلامذہ غالب میں شمار کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک وہ غالب کے نہیں، بلکہ میر زازین العابدین خان عارف کے شاگرد تھے۔ اسی لیے میں نے انھیں ''تلامذۂ غالب'' میں شامل نہیں کیا تھا۔ الک کا دیوان ان کی وفات (۷ یا ۲۷ جولائی ۱۸۶۱ء) اسے شوکت علی صاحب ساکن شاہ پور (فتح پور) نے مرتب کیا تھا، جو ان دونوں بھائیوں کے دوست تھے۔''(۱۱)

اسی سلسلے کی مزید وضاحت کے لیے مصنف تذکرہ نے الک کے بڑے بھائی ٹامس ہیدرلی کے حوالے سے کہ ان کا کلام کا مختصر مجموعہ (قلمی) دلی یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ ٹامس ہیدرلی کا اردو دیباچہ بھی الک کے دیوان کے شروع میں موجود ہے جس میں لکھتے ہیں:

''نواب زین العابدین خان دہلی کے امیر زادہ عالی خاندان جو عارف تخلص کرتے تھے اور جناب نجم الدولہ اسد اللہ خان بہادر غالب کے شاگرد تھے، وہ اس کے (یعنی الگزنڈر ہیدرلی کے) اوستاد تھے، اور اوس نوجوان کو اپنے استاد اور اپنے اوستاد کے اوستاد کے انداز پیشِ نظر تھے اور اکثر اون کے اشعار یاد تھے۔''(۱۲)

''تلامذۂ غالب'' طبع اول کی اشاعت کے حوالے سے شعرا کے حالات وکلام تک دسترس اور انتخاب کلام کے سلسلے میں بطور مالک رام:

''اب بھی میں اس تذکرے کو مکمل نہیں کہہ سکتا۔ ایسے بھی شاعر تھے کہ ان کا صرف تخلص ہی معلوم ہو سکا، نام اور کلام تک رسائی نہ ہوئی۔ مثلاً آزردہ وغیرہ۔۔۔۔ بعض اصحاب ایسے بھی تھے کہ ان کا نام اور تخلص دونوں معلوم ہو گئے، اگرچہ نہ مفصل حالات ملے، نہ زیادہ کلام ہی ہاتھ لگا مثلاً حسام، درد، طالب، رابطہ، سالم وغیرہ۔ انھیں البتہ میں نے سلسلے میں درج کر لیا ہے۔۔۔۔ انتخاب اشعار کا معاملہ ذاتی ذوق اور پسند پر منحصر ہے۔۔۔۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ جو شعر انتخاب میں آئے ہیں ان کے علاوہ اور کلام میسر ہی نہیں ہوا۔۔۔۔ بعض شعرا کے انتخاب کے متعلق یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ بہت طولانی ہے تو اس سے غرض یہ ہے کہ ان لوگوں کے دیوان

رفتہ رفتہ ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ اگر ان کے اچھے کلام کا معتدبہ حصہ اسی طرح ایک جگہ محفوظ کر دیا جائے تو شاید مفید ثابت ہو۔"(۱۳)

اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے "تلامذۂ غالب" طبع اول، طبع دوم کی اشاعت کا یہ کام اولاً ۱۹۵۸ء میں منظرِ عام پر آیا جس میں انھوں نے غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کے حالات تحریر کیے۔ غالب کے شاگردوں کے بارے میں یہ اس وقت تک کی تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ تھا ، لیکن متعدد محققین نے اس کتاب پر لکھے جانے والے تبصروں میں اور اس کے ردِ عمل میں تحریر کیے جانے والے مقالات میں مالک رام کی اس تصنیف میں تلامذہ کے تعلق سے ان کی تحقیق کی کمزوریوں، اغلاط اور خامیوں کی نشان دہی کی جن میں ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر وحید قریشی، تمکین کاظمی، کلب علی خان فائق، مشفق خواجہ، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، مرتضیٰ حسین فاضل، عبدالقوی دسنوی، اسماعیل پانی پتی، لطیف حسین ادیب، مرتضیٰ حسین بلگرامی وغیرہ کے مقالات نے "تلامذۂ غالب" کے ضمن میں ایک وقیع مواد فراہم کر دیا جس کے پیشِ نظر مالک رام نے اپنی اس کتاب پر نظر ثانی و اضافے کو ضروری سمجھا اور اس کی دوسری اشاعت کا اہتمام کیا جو ۱۹۸۴ء میں منظرِ عام پر آئی۔ کتاب کی اس دوسری اشاعت میں شاعروں کی تعداد بڑھ کر ۱۸۱ ہو گئی ہے۔ زیرِ نظر تذکرہ کی اشاعت طبع اول، طبع دوم میں ناکافی شواہد اور دلائل کی بنیاد پر حذف و اضافے ہوئے اور مآخذ و مصادر میں ترمیم تصحیح کے سلسلے میں معین الدین عقیل صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

"اولین اشاعت کے دو ایک نام انھوں نے ناکافی شواہد کی بنیاد پر حذف کر دیے۔ مستقل تلامذہ کے علاوہ مالک رام نے اشاعتِ اول میں ۲۹ افراد کے حالات تحریر کیے تھے جو غالب کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے۔ اشاعتِ دوم میں ایسے افراد کی تعداد چالیس تھی۔ اشاعت دوم میں اگرچہ نئے مآخذ اور تازہ تر تحقیقات کی مدد سے اضافے ہوئے تھے لیکن اس میں بھی محققین نے دل چسپی لی اور متعدد مقامات پر ترمیم و تصحیح کی جانب مالک رام کو متوجہ کیا۔"(۱۴)

مصنف تذکرہ نے تذکرے کی تکمیل میں جن اصحاب سے مدد لی اور تعاون حاصل رہا ان کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر (پٹنہ) اور مولانا امتیاز علی خان عرشی (رام پور) اور ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) کے نام ہیں۔ مذکور تذکرہ میں نہ صرف نئے شعرا کے نام اور حالات ملتے ہیں بلکہ ایسے شعرا کے حالات بھی مکمل صورت میں نظر آتے ہیں جن کے نام پہلے سے موجود تذکروں میں

پائے جاتے ہیں لیکن جہاں ان کے ذکر میں بہت سی نئی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ہر ایک کے ترجمے اور ذکر کے آخر میں مصنف نے مآخذ کا اندراج کیا ہے جن میں شاگردانِ غالب کے عزیزوں، قریبی رشتہ داروں، دوستوں، قیمتی ذخیرہ شدہ معلومات کے علاوہ رسائل اور گلدستوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ ۳۴ اصحاب کی تصاویر طبع اول میں شاملِ حال رہیں ان کے نام و تخلص کے ساتھ ہی تصاویر کی دستیابی کے بنیادی مآخذ کا تعین کیا گیا ہے اور ۲۷ اصحاب کی تصاویری ذرائع سے دستیابی ممکن بنائی گئی ہے اور جن شعرا کی تصاویر پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہیں وہ تفتہ، زکی، رشکی، رمز، رفعت، رنج، شوکت اور وفا ہیں۔ طبع دوم میں سات نئی تصویریں شاملِ تذکرہ ہو رہی ہیں۔ یہاں بھی وفا کی تصویر کے علاوہ سب پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہیں۔ طبع اول میں جس وفا کی تصویر کا ذکر ہے اس کا مآخذ ذخیرۂ منشی مہیش پرشاد مرحوم (بشکریہ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ) ہے اور طبع دوم میں جس وفا کی تصویر کا ذکر ہے اس کا تخلص وفا و اختر ہے اور اس کا مآخذ خواجہ عبدالغفار جہانگیر نگری پروفیسر کلیم سہرامی راج شاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش نے ''غالب نامہ'' نئی دہلی کے شمارہ (۴:۲) میں شائع کی ہے۔ مصنف تذکرہ نے مآخذات کو اس طرح وضاحت سے بیان کیا ہے:

> ''علائی کا کلام ان کی غیر مطبوعہ بیاض سے لیا گیا ہے، جو ہز ہائنس نواب مرزا امین الدین احمد خان بہادر ثانی (لوہارو) بالقابہم کی نوازش سے دیکھنے کو ملی، میں نے منشی مہیش پرشاد کی یادداشتوں سے بھی استفادہ کیا۔ تفتہ کے حالات کی تحقیق کے لیے سکندر آباد گیا تو وہاں کی کوچہ گردی میں جناب شیوراج بہادر مرحوم (دہلی) میرے شریک غالب رہے تھے۔''(۱۵)

''تلامذۂ غالب'' میں بعض تلامذہ ایسے ہیں جنھوں نے ایک سے زیادہ تخلص اختیار کیے۔ ایک طبقہ تو ان حضرات کا ہے جنھوں نے پہلے ایک تخلص کے تحت شاعری کی، بعد کو اسے ترک کر دیا اور دوسرا تخلص اختیار کر لیا۔ ایسے مرد حضرات کا متروک تخلص بریکٹ میں دیا گیا ہے۔ مثلاً فراق (رشکی)، شاعر کا ابتدائی تخلص 'رشکی' تھا جسے ترک کر کے وہ فراق کے تحت لکھنے لگے، دوسرا طبقہ وہ ہے جہاں شاعر بہ یک وقت شروع سے آخر تک ایک سے زیادہ تخلص لکھتے رہے مثلاً ذکا و بے باک، شاعر نے آخر تک دونوں تخلص استعمال کیے ہیں۔

زیرِ نظر تذکرہ ''تلامذۂ غالب'' طبع سوم، ترامیم و اضافوں کے ساتھ دراصل تیسری تصنیف اور اولین پاکستانی اشاعت ہے جس میں مصنف تذکرہ نے ترامیم و اضافوں کو چار ضمائم میں تفصیلاً روشناس کرایا ہے اور تنقیدی نقطۂ نظر سے کسی بھی قسم کے ابہام کی گنجائش اس قدر معتبر و اعلیٰ تصور دیا ہے کہ شاگردانِ غالب کے معیارِ ترجیح کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مزید ابہام یا

شک کی گنجائش کے سلسلے میں پیدا ہونے کے امکان کم ہیں۔ تذکرے میں اذکار کا ذکر بہر حال قوی تر ہے، ضمائم کے پیشِ نظر پہلے ضمیمہ میں شاعر حکیم غلام مولیٰ عرف مولا بخش قلق میرٹھی کے ذکر میں حالات و کلام کے ساتھ پہلے سے موجود تذکروں حوالوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

> ''اگرچہ قلق نے نہ کسی مرحلے پر غالب کی شاگردی اختیار کی، نہ اپنے کلام پر ان سے اصلاح لی، لیکن اس کے باوجود (غالباً قلق سے استصواب کیے بغیر) غالب نے ان کے کلام پر اصلاح دی تھی۔ ان نظموں میں سے دو بطورِ نمونہ درج ذیل ہیں۔''(۱۶)

دوسرا ضمیمہ ''تلامذۂ غالب (طبع ثانی) پر ایک نظر'' کے عنوان سے ہے جس میں شاگردانِ غالب کے حالات و کلام اور تلمذ کی صورتوں میں اضافے، ترامیم اور تبدیلیوں کا بیان ہے تاکہ اس ایڈیشن کو زیادہ جامع اور مفید بنایا جا سکے۔ اس کے باوجود مصنف تذکرہ لغزش خاصۂ بشریٰ کا اعتراف کرتے ہوئے چند ایسے بیانات کی نشان دہی کی ہے جن کے متعلق مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے یا انھیں قابلِ ترامیم یا وضاحت طلب مقامات کہا جا سکتا ہے، تیسرے اور چوتھے ضمیمہ میں ان اصحاب کے حیات و کلام کی حوالوں کے ساتھ تصحیح کا بیان ہے۔ طبع اول میں مذکور اصحاب میں جن کا ذکر بہ متخلص الف بائی ترتیب سے ہے ان میں انجم محمد علی خان پوری، بے صبر منشی بال مکند سکندرآبادی، تفتہ منشی ہر گوپال سکندرآبادی، جناب پنڈت امراؤ سنگھ لاہوری، حسین علی بیگ مرزا، خاور مرزا احمد اکبر خان قزلباش، ذکا و بے باک، مولوی محمد حبیب اللہ مدارسی ثم حیدرآبادی، رند جانی بانکے لال جی، سرور محمد امیر اللہ اکبر آبادی، طرزی (ثاقب)، قطب الدین دلاور علی جعفری ہاپوڑی، عرشی سید احمد حسین قنوجی، عزیز میرزا یوسف علی خان بنارسی، علی نواب علی بہادر (باندہ)، فدا و جمالی سید احمد حسن سہوانی ثم بڑودی، فدا صاحبزادہ فدا علی خان بہادر رامپوری، قدر سید غلام حسنین بلگرامی محمود محمد حسین نہٹوری بجنوری، محو نواب غلام حسین خان دہلوی، معجز منشی آغا علی سہ سوانی، مکیش میر احمد حسین دہلوی، مکیش و محوی ارشاد احمد دہلوی، نسیم نواب محمد حسین علی سلطان، نشاط بابو ہر گوپند سہائے نظام (مضطر رعنا) نواب محمد مردان خان مراد آبادی، پیر حکیم محب علی کاکوروی، وحید وحید الدین احمد خان، ہوشیار (بیمار) مولوی حکیم محمد مراد علی، ان کے علاوہ ''تلامذۂ غالب'' میں مذکور شدہ نئے ناموں میں میر افضل علی اکمل، منشی منصور علی خان، قاضی شریف حسین خان شریف دہلوی، میجر خان جیکب، چوہدری عنایت الٰہی مارہروی، حکیم

غلام نجف خان، قاضی عابد علی خاں فریاد، منشی سہیل چند منشی، سید محمد زکریا شاہ نظام پوری، نواب کلب علی خاں نواب ہیں۔

زیرِ نظر ایڈیشن میں جن متعدد نئے ناموں کا اضافہ ہوا ہے ان کے سلسلے میں مذکور تذکرہ میں یوں بیان ہے:

> ''پچھلے ایڈیشن کے بعض تبصرہ نگاروں نے کچھ شاعروں کے غالب سے رشتہ تلمذ پر شبہے کا اظہار کیا تھا، ان میں سے دو ایک نام اس لیے حذف کر دیے گئے ہیں کہ ''ان کے تلمذ کے لیے کافی ثقہ شہادت موجود نہیں''لیکن باقی شاعروں کو اس اصول کے تحت کہ ''اگر کسی تذکرہ نگار یا ثقہ راوی نے تلمذ کا ذکر کیا ہے تو اسے تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔''بدستور زمرۂ تلامذہ میں شامل رکھا گیا ہے۔ محترم مصنف کے اس معیارِ ترجیح کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاگردانِ غالب کی موجودہ فہرست میں مندرجہ ذیل افراد کے ناموں کے لیے مزید گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے۔ غالب سے ان لوگوں کا رشتہ تلمذ حکیم غلام مولیٰ قلق میرٹھی کی نسبت شاگردی کے مقابلے میں بہر حال قوی تر ہے۔''(۱۷)

غالب اور ان کے تلامذہ سے متعلق وقتاً فوقتاً جو تحقیقی مضامین منظرِ عام پر آئے فاضل تذکرہ نگار نے ان سے بھی استفادہ کیا۔ اس سے نہ صرف تلامذۂ غالب کی تعداد میں اضافہ ممکن ہو سکا بلکہ اُس کے احوال بھی زیادہ محقق طور پر سامنے آ سکے۔ مالک رام نے اس تذکرہ کو تحقیق و تنقید اور تاریخ کے بہت قریب کر دیا ہے اور واقعتاً موصوف کا یہ کارنامہ تذکرہ نگاری کے روشن مستقبل کا ضامن ہے۔ فاضل تذکرہ نگار نے شعرا کے تراجم میں بے جا تفصیلات سے احتراز کیا ہے اور غالب کے ایسے تلامذہ جنھوں نے غالب سے قبل جن دیگر اساتذۂ فن سے استفادہ کیا تھا ان کے تراجم میں اس جانب بھی اشارے کیے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے تلامذہ جن کے کلام پر استاد کے کلام کا شُبہ ہوتا ہے فاضل تذکرہ نگار نے اُن مقامات پر تحقیق و تنقید کے تناظر میں نقد و تبصرہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر نواب یوسف علی خان ناظم کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ شُبہ عام طور پر وارد کیا گیا ہے کہ ناظم کے دیوان میں غزلوں کی غزلیں ایسی ہیں جن پر غالب کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہی اندازِ فکر، وہی اسلوبِ بیان، وہ مضمون آفرینی اور خاص خاص الفاظ اور ترکیبیں جو غالب کے کلام کی خصوصیات ہیں ہمیں ناظم کے دیوان کی کئی غزلوں میں اس حد تک ملتی ہیں کہ ہم اُنھیں محض استاد کی اصلاح تک محدود نہیں کر سکتے۔ یوں معلوم

ہوتا ہے کہ یہ کلام کچھ استاد نے خود کہہ کر شاگرد کے حوالے کر دیا تھا۔ اس شُبے کی تقویت ایک اور بات سے بھی ہوتی ہے کہ ناظم ۱۸۵۷ء کے شروع میں غالب کے شاگرد ہوئے اور ان کا خاصا ضخیم دیوان چار برس بعد ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔ ایک بالکل مُبتدی کے لیے جس نے اس سے پہلے کبھی ایک مصرع تک نہ کہا ہو اتنی قلیل مدت میں اتنے وافر کلام کا مالک ہو جانا حیرت ناک ضرور ہے۔"(۱۸)

تلامذۂ غالب کے عمیق مطالعہ سے اس کمی کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ فاضل تذکرہ نگار نے کہیں بھی تلامذۂ غالب کے کلام پر غالب کی اصلاح کے نمونے پیش نہیں کیے جب کہ تفہیمِ غالب کے ضمن ان کا پیش کیا جانا محض ضروری تھا۔ اس سے قطع نظر مالک رام نے فیل و ثوق کا شمار تلامذۂ غالب میں محض امکان کے طور پر ہی کیا ہے اور اس کی بنیاد غالب کے ایک ایسے خط کو بنایا ہے جو بقول مرتب، اس سے یہ نہیں کھلتا کہ واقعی انھوں نے اصلاح دینا منظور کیا یا نہیں۔ پوری عبارت اس طرح ہے:

"۱۸۶۷ء میں یہ اصلاح کی درخواست لے کر غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ معلوم نہیں غالب نے یہ درخواست قبول کی یا نہیں۔ غالب نے ان کے خط کا جو جواب دیا تھا "کلیاتِ فوق" میں شامل ہے۔ (ص ۱۴۵۔۱۴۶) اس سے یہ نہیں کھلتا۔۔۔ بہر حال فوق کا نام شامل تبصرہ کر لیا گیا کیونکہ اس کا امکان ضرور ہے۔"(۱۹)

بہتر تو یہ تھا کہ فاضل مصنف ناظم نواب یوسف علی خان بہادر کے اس خط کو یہاں پیش بھی کر دیتے جس کے مطالعے سے ادب کا عام قاری بھی اپنے طور پر کوئی نتیجہ اخذ کر سکتا۔ علاوہ ازیں فاضل تذکرہ نگار نے تلامذہ کے احوال و افکار میں ایسے اشعار بھی کثیر تعداد میں پیش کر دیے ہیں جن میں ان شعرا کی جانب سے شرفِ تلمذ کا اظہار ملتا ہے۔ ان میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وفا طالب۔۔۔ میر ابراہیم علی خان سہسوانی کے ذکر میں ملاحظہ ہوں:

بجا لاؤ وفا، شکرِ خدا، ہو صاحبِ قسمت
کیا اُستاد اپنا تم نے غالب سے سخنداں کو(۲۰)

مونس۔۔۔
پنڈت شیوجی رام دہلوی
نے غالبؔ سے اپنی
عقیدت کا اظہار یوں کیا
ہے:

شعر کہنا سخت مشکل ہے
مگر غالب گواہ
مونس ہے شاگرد استادِ
زماں مغفور کا(۲۱)

بے صبر۔۔۔ منشی بال مکند سکندر آبادی اپنے استاد کے عاشق زار تھے۔ ایک قصیدہ ''پرکالۂ آتش'' اس سے متعلق کہتے ہیں:

جس کا غالب ہے تخلص
اسداللہ ہے نام
یہ تو ہے کفر جو کہے کہ ہے
یزداں مرا
پر ہے ہادی مرا، رہبر مرا،
استاد مرا
قبلہ ہے، کعبہ ہے، دین
مرا ، ایمان مرا
مجھ کو گویا ہے حدیث اس
کا جو ہے اردو کلام
قاری اس کا وہ دیوان ہے
قرآں مرا(۲۲)

بیدل سہارن پوری کے
ذکر میں وہ یوں لکھتے ہیں:

چنے ہے پھول بیدل
حضرت غالب کے گلشن
سے(۲۳)

فاضل تذکرہ نگار نے تلامذہ کے انتخاب میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرنے والے شعرا میں کوئی تخصیص نہیں کی ہے اور تحقیقی نقطہ نگاہ سے اس بات کی بڑی اہمیت ہے۔ علاوہ ازیں صاحبِ تلامذۂ غالب نے شعرا کے تراجم میں ماخذات کی نشان دہی کی جانب اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے۔ مختصر یہ کہ تلامذۂ غالب کا مطالعہ غالب کی شاعرانہ عظمت، سیرت و شخصیت اور عہدِ غالب کا مطالعہ ہے۔ تلامذۂ غالب کے پردے پر غالب کا پورا سماجی ماحول اور گرد و پیش کے حالات و مناظر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اگر ہم غالب کو اس سماجی پس منظر میں پڑھنا چاہیں تو اس کے لیے ہم کو تلامذۂ غالب سے بہت مدد ملے گی۔

غالب کی پرسش کے ضمن میں بیدل (رسوا) مہاراجہ کشن پرشاد کی خدمت میں پیش کردہ قصیدے کے ایک بند کا پہلا شعر:

غالب کی رزم بزم کا ادنیٰ
سا خوشہ چیں
ہے بیدل شکستہ قدم بوس
آستاں (۲۴)

مزید ان کے
انتخاب کلام سے اس بات
کی تائید ہوتی ہے:

روح سے حضرت غالب کی
مدد ملتی ہے
بیدل خستہ ہے، اِک طفلِ
دبستان اب تک (۲۵)

ان تمام تر تحقیقات کے نتیجے میں مالک رام کی ان محققانہ اور معتبر کاوشوں کی داد دیتے ہوئے جناب معین الدین عقیل صاحب لکھتے ہیں:

> ''مالک رام کا یہ اہم تحقیقی کارنامہ ایک عرصے سے ''ادارہ یادگارِ غالب'' کے اشاعتی منصوبے میں شامل تھا، لیکن اشاعت اب ممکن ہوئی۔ یہ اشاعت فاضل مصنف کی تحقیق نو اور ترمیم و اضافے کے بعد اور خود مصنف کی خواہش پر ادارۂ یادگارِ غالب کے اہتمام سے عمل میں آرہی ہے۔'' (۲۶)

اس ضمن میں کاتب تذکرہ ''تلامذۂ غالب'' نے ہمیں غالب کے ایک سو اکاسی شاگردوں کے نام اور کلام کا حال ہی متعارف نہیں کرایا بلکہ اس کی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک پوری تہذیب سے تعارف کا وسیلہ بنایا ہے جہاں غالب کی حیثیت مرکزی اور

محوری ہے۔ مذکور تذکرہ اصل میں علمی اور تحقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقی واقعات اور شہادتوں پر مبنی ہے جس کے ذریعے ہم تجربے اور طرزِ اسلوب کے ایک واضح اور روشن نظام تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا غالب شناسی کے ضمن میں یہ ایک نہایت وقیع کارنامہ ہے جو اپنی افادیت، معنویت اور علمی مرتبے کے لحاظ سے بیش بہا معلومات کا خزینہ اور ایسا قیمتی سرمایہ ہے جو یقیناً دورِ حاضر کے اسکالرز، قارئین اور آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کا کام دے گا۔

حوالہ جات

1. یاسر جواد، سید، انسائیکلو پیڈیا ادبیاتِ عالم (دنیا اور پاکستان)، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص:۸۵۳
2. شاہد ماہلی، مالک رام محقق اور دانش ور، دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۱ء، ص:۱۹
3. ایضاً، ص:۲۰
4. مالک رام، تلامذۂ غالب، کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب، طبع سوم، ۲۰۰۸ء، ص:۸۳۲
5. عبدالحق، مولوی، مقدمہ: گلِ عجائب، مصنفہ: اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی، اورنگ آباد (دکن): انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۶ء، ص:و، ز
6. مالک رام، تلامذۂ غالب، ص:۱۵
7. ایضاً، ص:۱۷
8. ایضاً، ص:۱۸
9. ایضاً، ص:۳۰
10. ایضاً، ص:۳۱
11. ایضاً، ص:۲۲
12. ایضاً، ص:۲۴_۲۳
13. ایضاً، ص:۳۲
14. ایضاً، ص:۱۶
15. ایضاً، ص:۳۳
16. ایضاً، ص:۸۲۸
17. ایضاً، ص:۸۵۲
18. ایضاً، ص:۷۵۹
19. ایضاً، ص:۲۵۷
20. ایضاً، ص:۸۰۳
21. ایضاً، ص:۷۴۱
22. ایضاً، ص:۱۴۹
23. ایضاً، ص:۹۲
24. ایضاً، ص:۱۳۳
25. ایضاً، ص:۱۳۳
26. ایضاً، ص:۱۶